ISSN (Online): 3007-3294, ISSN (Print): 3007-3286, HEC Recognized Y-Category Journal

ماریہ خان
ایم فل اُردو اسکالر، نمل، اسلام آباد

ناول اور سماجی شعور: علی ارشد رانا کے ناول میں حقوقِ اطفال کا تجزیاتی مطالعہ

Maria Khan
MPhil Urdu Scholar, NUML, Islamabad

The Novel and Social Awareness: An Analytical Study of Child Rights in *Ali Arshad Rana's* Novel

ABSTRACT
Ali Arshad Rana is a modern novelist who reflects the changing trends and techniques in different literary periods, while also addressing social issues through imagery, which is becoming increasingly important in literature. In his novel *Jalta Raha Charag Yaqeen-o-Guman Ka*, Rana exposes the facade and so-called "doctors" of society, highlighting the crucial role that parents, teachers, and educational institutions play in the education of children. He emphasizes the importance of well trained teachers, who are vital in shaping a nation's future. In this article it is tried to explore that how author identified the problems and shortcomings in children's education and suggested the solutions to these issues, showcasing the maturity of his social consciousness throughout the novel.
Keywords: *The literary novelist, Trend and technique, Exposing Reflection of social issue, Social imagery, Trained Teacher, Social consciousness, Maturity, Training of child, Child rights*

ناول اردو ادب میں کوئی نئی صنف نہیں۔ ناول کے ذریعے بہت سے ادیبوں نے سماجی شعور کی ترسیل اور ترویج کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اردو میں ناول نگاری کا آغاز مولوی نذیر احمد نے کیا۔ سیاسی و سماجی حقیقتوں کا عکس نذیر احمد کے ہاں نظر آتا ہے۔ نذیر احمد کے ناول "ایامی" اور "ابن وقت" سماجی شعور کے عکاس ہیں۔ اس کے بعد سرشار کا نام آتا ہے۔ اپنے مشہور ناول "فسانہ آزاد" میں سرشار نے دو کرداروں "آزاد" اور "خوجی" کے ذریعے سماجی شعور دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحکیم شرر کے ناولوں میں سماج کے مسائل کی جھلک واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ شرر کے ناولوں میں "بدر النساء کی مصیبت"، "خوفناک محبت" سماجی شعور کی بہترین مثالیں ہیں۔ مرزا ہادی رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا"، علامہ راشد الخیری کے ناول "صبح زندگی"، "شام زندگی" میں سماجی شعور کی عکاسی کی گئی ہے۔

بیسوی صدی کی دوسری دہائی کے ناول نگار پریم چند کے ناول اور افسانے اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی مسائل کی نمایاں عکاس ہیں ۔پریم چند نے اپنے ناولوں کے ذریعے شعوری طور پر عوام کے مسائل کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔بقول احتشام حسین:

"پریم چند اپنے دور کے شعور کے ان پہلوؤں کے ترجمان ہیں جو غلامی پر آزادی کو قدامت پرستی پر اصلاح کو، تنگ نظری پر بلند نگاہی کو، طبقاتی جبر اور ظلم پر انصاف اور مساوات کو سامراج یا آمریت پر جمہوریت کو ترجیح دیتے ہیں۔"(1)

ترقی پسند تحریک کے آنے کی وجہ سے ہندوستان کے اندر سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیاں رونما ہوئی۔ یہ اس عہد کے ناولوں میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ نمایاں ناولوں میں "لندن کی ایک رات" از سجاد ظہیر، "ضدی" از عصمت چغتائی، "ایسی بلندی ایسی پستی" از عزیز احمد، "شکست" از کرشن چندر اور "ایک چادر میلی سی" از راجند سنگھ بیدی کا شمار ہوتا ہے۔ تقسیم ہند کے حوالے سے متعدد ناول لکھے گئے، جن میں تقسیم ہند کے موضوعات کو وضاحت کے ساتھ زیر بحث لایا گیا ہے۔ احسان اکبر قیام پاکستان کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کئی ایسے ناول بھی منظر عام پر آئے ہیں جس میں صرف قیام پاکستان کے واقعات کو ہی موضوع بنایا ہے۔ یہ ناول نگاری میں تیسرا بڑا رحجان بن کر سامنے آیا۔ اس رحجان سے متاثر ہوتے ہوئے رئیس احمد جعفری نے "مجاہد"، قیس رامپوری کا ناول "خون"، نسیم حجاری نے ناول "خاک وخون" تحریر کیا۔ بعد میں تقسیم کے موضوعات پر بہت لکھا گیا۔ ان میں جمیلہ ہاشمی کا "تلاش بہاراں" قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" اور عبد اللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" اس موضوع کو چھوتے ہیں۔ خدیجہ مستور کا ناول "آنگن "کا رویہ تاریخی کا سانہیں مگر اس کے باوجود ان کے ہاں تاریخ اور کہانی کے حقائق کو بڑی عمدگی سے ادغام ہوا ہے۔"(2)

ان تمام ناول نگاروں نے اپنے اپنے طریقے سے سماج کے مسائل اور ان کے حل کو بیان کیا ہے۔ شوکت صدیقی نے اپنے ناول "خدا کی بستی" کے ذریعے پاکستان کے نئے معاشرے کی منظر کشی کی ہے۔ شوکت صدیقی ظلم، استحصال جیسی برائیوں کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ساٹھ کی دہائی میں ترقی پسند تحریک پر پابندی اور 1958ء کا مارشل لاء ایسی دو تبدیلیاں ہیں جس نے بعد میں آنے والوں کو متاثر کیا۔ ساٹھ کی دہائی کے بعد لکھنے والوں نے ان تبدیلیوں کے اثرات کو قبول کیا۔ ان اثرات سے متاثر ہونے والوں میں انتظار حسین کا ناول "بستی"، بانو قدسیہ کا ناول "راجہ گدھ" اور انور سجاد کا ناول "جنم روپ" شامل ہیں۔ اردو ناول نگاری میں سماجی مسائل کی عکاسی کوئی نیا موضوع نہیں۔ زمانہ قدیم سے سماجی شعور کی ترویج کے لیے نثر بالخصوص ناول کو بہترین صنف سمجھا گیا ہے۔ سماجی شعور کو سمجھنے کے لیے ہمارا سماج کو سمجھنا ضروری ہے۔ لفظ "سماج" ہندی زبان سے اردو میں آیا ہے۔ اس کے معنی "ایک ساتھ مل جل کر رہنے کے" ہیں۔ اردو

میں اس لفظ کے لیے کئی مترادف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جن میں سب زیادہ استعمال ہونے والا لفظ "معاشرہ" ہے جبکہ انگریزی میں اس کے متبادل کے طور پر(Society) کا لفظ آتا ہے۔"شعور" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی" آگاہی" کے ہیں۔انگریزی میں اس کے لیے(Awareness) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔افضال بٹ لکھتے ہیں:

"سماجی شعور، سماجی آگاہی اور پہچان سے عبارت ہے۔یہاں وہ تغیر و تبدل اہم
ہے جو ہمہ وقت کسی سماج میں جاری وساری رہتا ہے۔اور زندگی کا نیا رخ متعین
کرتا ہے۔ساتھ ہی ساتھ سماج کے عمومی وخصوصی رویے اور منفی اور مثبت سطح
پر اس کے انفرادی زاویوں سے آگاہی بھی سماجی شعور کے دائرے میں آتی ہے۔"(3)

علی ارشد رانا اردو کے جدید ناول نگاروں میں سے ایک ہیں۔علی ارشد رانا کا تعلق پنجاب کی صوبائی سول سروس سے ہے۔2022ء تک بطور ایڈیشنل سیکرٹری زراعت خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔قبل ازیں پنجاب کے ایک درجن سے زائد اضلاع میں انتظامی عہدوں پر تعنیات رہے ہیں۔جن میں چار تعنیاتیاں بطور اسٹنٹ کمشنر،اور تین بطور ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر قابل ذکر ہیں۔ان کی درج ذیل تصانیف اب تک منظر عام پر آچکی ہیں:عالمی سیریز کے نام سے پانچ کتب لکھیں جو تھارٹی منٹ سریز کے نام سے مشہور ہے۔اس میں انگریزی زبان کی گرائمر کے حوالے سے تفصیلاً بتایا گیا ہے۔یہ کتاب عالمی کتاب لاہور سے شائع ہوئی۔Explore reword of English کی پانچ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔یہ کتاب سی ایس ایس کے امتحان کے حوالے سے ہے۔پنجاب ری کلچرل مارکیٹنگ ایگولیٹری اتھارٹی ایکٹ ،2018ء(ترمیم شدہ 2019ء) مع مارکیٹ کمیٹیز (قیام و تشکیل) ذیلی قواعد 2019ء،ترجمہ شدہ،،پاکستان لاء ٹائمنر پبلیکیشنز،لاہور،2021ء، مٹی سے محبت، مختلف پیشہ وارنہ موضوعات پر چھ عدد کتابوں کی تصنیف مکمل ہو چکی ہے۔

ناول "جلتا رہا چراغ یقین و گمان کا " علی ارشد رانا کا تحریر کردہ ہے۔یہ ناول 150 صفحات پر مبنی ہے۔اس کو تین بڑے حصوں میں تحریر کیا گیا ہے۔یہ ناول واحد متکلم کے صیغے سے آگے چل رہا ہے۔ہر حصے کے عنوان سے اس میں موجود مواد کا پتہ چلتا ہے۔ اس ناول میں سماجی رویوں ، والدین کے اپنے بچوں کے ساتھ تعلقات ،ہمارے تعلیمی نظام کی خرابیوں اور ڈاکٹر کے پیشے کے حوالے سے حیران کن انکشافات کیے گئے ہیں۔

ناول میں مرکزی کردار دانش کا ہے۔دانش کی پیدائش کے وقت اس کے والد صاحب ضلع بہاؤالدین کی تحصیل پھالیہ میں بطور سپیشل جوڈیشل مجسٹریٹ تھے۔دانش کو اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ سکول جاتے ہوئے تین سال ہوگئے تھے۔دانش پیدائشی طور پر بہت خوبصورت تھا۔دانش کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی دانش کے والد کا تبادلہ سیالکوٹ ہو جاتا ہے،تو دانش کے خاندان کو مرید ان کے آبائی گاؤں میں منتقل ہونا پڑتا ہے۔دانش جب چار سال کا ہوتا ہے تو اسے مرید کے ایک اچھے سکول میں داخل کروایا جاتا ہے۔اب دانش کو سکول جاتے ہوئے تین سال ہوگئے

ہیں۔اس عرصے کے دوران دانش کے سکول سے متعدد بار پیغام آچکا تھا کہ والدین سکول آکر پرنسپل سے ملیں۔جب دانش کے والد صاحب سکول پہنچے تو پرنسپل صاحبہ نے بتایا کہ مجھے یہ بتاتے ہوئے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ آپ کا بیٹا ذہنی لحاظ سے باقی بچوں جیسا نہیں ہے۔دانش کے والد صاحب کے سوال کرنے پر پرنسپل صاحبہ نے بتایا کہ دانش کی ٹیچر کئی بار اس خدشے کا اظہار کر چکی ہیں کہ دانش کو سکول آتے ہوئے تین سال گزر چکے ہیں لیکن نہ اسے اردو پڑھنا آتی ہے اور انگریزی اور میتھ بھی اسے سمجھ میں نہیں آتی۔دانش کے والد صاحب نے تجزیہ پیش کیا کہ یہ تو کوئی ایسی باتیں نہیں ہیں، جس کی بنا پر اس کو کند ذہن یا کم عقل قرار دیا جائے۔دانش کی ٹیچر کا کہنا تھا کہ دانش کلاس میں بچوں کے ساتھ گھلتا ملتا نہیں ہے،اور نہ ہی اس کا رویہ دوسرے بچوں جیسا ہے۔اس ناول "جلتا رہا چراغ یقین و گمان کا" کے مطالعے سے ناول میں موجود سماجی شعور کی نشاندہی ہوتی ہے۔انھوں نے بہت درد مندی سے ہماری روزمرہ کی زندگی کے ایک ایسے مسئلہ کو اُجاگر کیا جیسے عموماً ہم نظر انداز کرتے ہیں۔معاشرے اور تعلیمی اداروں کے منفی رویے سے بچوں کا سنہرا مستقبل داؤ پر لگ جاتا ہے۔اگر والدین تربیت کے دوران بچے کے مسائل سمجھنے کی کوشش کریں تو معاشرے کے اس توجہ طلب پہلو کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ایک انٹرویو میں مصنف سے جب سوال پوچھا گیا کہ انھوں نے کس خیال کے تحت یہ ناول لکھا ہے تو جواب میں انھوں نے بتایا:

> "ہمارے سکول خاص طور پر گورنمنٹ اور پرائمری سکول بھی روزانہ کی بنیاد پر ایک دو ہزار بچوں کو سکولوں سے نکال دیا جاتا ہے کہ آپ کا بچہ پڑھ نہیں سکتا۔ اس کا ذہن کام نہیں کرتا اور اسے کام پر لگا دیں۔اس وجہ سے بچے کے والدین اسے ہوٹل میں چھوٹا، کار میکینک، اور مال برداری کے کام پر لگا دیتے ہیں۔بنیادی طور پر مجھے اپنے قیمتی سرمایے یعنی بچوں کو بچانے کی کاوش کرنی تھی۔"(4)

دانش کے والد نے دانش کے ننھیال اور اپنی پوری فیملی پر نظر ڈالی تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کے خاندان میں ایسا کوئی نہیں ہے جو اس مسئلے کا شکار ہو۔تو انھوں نے اس سارے مسئلے کا حل یہ نکالا کہ دانش کو کسی دوسرے سکول میں داخل کروا دیا جائے۔دانش کے والد صاحب کے خیال میں سکول کے ماحول میں کمی یا خرابی ہے یا پھر اساتذہ تعلیم یافتہ نہیں ہے، یا پھر انھیں پڑھنے کا صحیح طریقہ نہیں آرہا ہے جس کا ذمہ دار ان کے بیٹے کو قرار دیا جا رہا ہے۔دانش کے والدین بجائے اپنے بچے پر توجہ دینے یا پھر اس کے مسائل کو حل کرنے کے اصل قصوروار سکول اور اساتذہ کو سمجھتے رہے۔جو سراسر غلط رویہ ہے۔ہمارے ہاں اس طرح کے رویے عام طور پر پائے جاتے ہیں۔

دانش کی دادی کو جب سارے معاملے کو پتہ چلا تو انھوں نے کہا کہ ان کے پوتے کو کسی دشمن کی نظر لگ گئی ہے۔اب انھوں نے معمول بنا لیا تھا کہ صبح فجر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن پاک کرتی، پھر جتنی بھی سورتیں آتی تھی ان کو پڑھ

کر ایک گلاس پانی میں پھونک دیتی اور وہ پانی دانش کو پلاتی، شام میں مغرب کی نماز کے بعد بہت سے وظائف کرتی اور اس کو پانی میں پھونک کر دانش کو پلاتی۔ دانش کی دادی کی رائے یہ تھی کہ اس پر کسی نے تعویذ کر رکھے ہیں۔ دانش کی دادی نے ایک عامل کو ڈھونڈ لیا تھا، ان کا کہنا تھا کہ جادو بر حق ہے۔ ہمارے آخری نبی ﷺ پر بھی جادو کیا گیا، اللہ کے کلام میں بہت شفاء ہے۔ دانش کی دادی دانش کو 'باباجی کھلاں والی سرکار' (باباجی کھالوں والی سرکار) کے پاس لے کر گئی، باباجی کا طریقہ کار یہ تھا کہ جو بھی بندہ ان کے پاس جاتا وہ بتاتے کہ اس پر کسی جن یا پری کا سایہ ہے۔ پھر اس شخص کو کلورو فارم میں بجھی ہوئی موٹے کاغذ کی بتیاں جلا کر دُھونی دی جاتی اور باباجی معمول کے مطابق دھمکیاں دینا شروع کر دیتے۔ ہر انسان کے لاشعور میں کچھ باتیں موجود ہوتی ہے، وہ انسان مدہوشی کی وجہ سے ان میں سے کوئی بات بتادیتا ، یا پھر اس جگہ کا نام لیتا جس جگہ سے بچپن میں اِسے ڈرایا جاتا تھا۔ دانش کے ساتھ بھی یہ سارا معاملہ دُہرایا گیا۔ باباجی کے مطابق دشمنوں نے دانش پر تعویذ کروائے ہوئے ہیں، جس نے دانش کی دادی کے شک کو مزید تقویت ملی۔ باباجی کے تعویذ سے دانش پر کوئی اثر نہیں ہوا، تو دانش کی دادی اسے ایک اور پیر صاحب کے پاس لے گئیں۔ اس پیر صاحب نے پانی کی بوتل میں کچھ تعویذ حل کرکے دیے۔ جب یہ نسخہ کام نہ آیا، تو اس باباجی نے مٹی کی پیالوں والے لکھے والے تعویذ دے، جس کا بھی دانش پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب دانش کی بیماری کی خبر اس کے ننھیال تک پہنچ چکی تھی۔ دانش کی نانی دانش کو لاہور میں واقع ایک بزرگ کے مزار پر لے گئیں اور وہاں دانش کے نام کی دو دیگیں بھی چڑھائی گئیں۔ لیکن اس سے بھی آفاقہ نہیں ہوا، بلکہ دانش کی حالت مزید بگڑ گئی۔

دانش کی دادی اور نانی کا رویہ ہمارے مذہبی اعتقاد کو سامنے لاتا ہے، ہمارے ہاں ایک رویہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اگر کوئی بیماری، مصیبت یا پریشانی ہمارے اوپر آجائے تو ہم اس کو اپنے دشمنوں کی چال یا تعویذ وغیرہ کا اثر سمجھتے ہیں اور بجائے اس بیماری یا مصیبت کا حل نکالنے کے جعلی پیروں اور فقیروں کے پاس جاتے رہتے ہیں جو ہمارے کمزور مذہبی اعتقاد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں لُوٹنے کے سوا کچھ نہیں کرتے ،اور بعض موقعوں میں تو دو گروہوں کے درمیان دشمنی اور خون خرابے کا بھی سبب بنتے ہیں۔ قندیل جعفری لکھتی ہیں:

> "مصنف نے معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو بڑی خوبصورتی سے بے نقاب کیا ہے۔
> مصنف نے اپنی تحریر میں جعلی پیروں کے گھناؤنے چہرے کو بڑی مہارت سے
> بے نقاب کیا ہے اور لوگوں کو ان سے دور رہنے کی تنبیہہ کی ہے۔"(5)

دانش کو پھر ایک دوسرے سکول میں داخل کروادیا گیا۔ دانش کے دوسرے سکول سے بھی وہی پیغام دیا گیا کہ ان کا بچہ کند ذہن ہے۔ اب دانش کے والد اس کو ایک ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے۔ اس ڈاکٹر صاحب کا نام معراج منظور تھا۔ ڈاکٹر معراج منظور بچوں کے جنرل فزیشن تھے۔ انھوں نے دانش کے حوالے سے کچھ سوال کیے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ بظاہر

دانش کو کوئی مسئلہ نہیں ہے، اور ساتھ ہی دانش کو کسی نیوروز فزیشن سے بھی چیک کروانے کا مشورہ دیا۔ دانش کے والد صاحب نے اصرار کیا کہ دانش کا کوئی ٹیسٹ کروایا جائے تاکہ کسی فیصلے پر پہنچا جا سکے۔، جس پر ڈاکٹر صاحب نے ٹیسٹ کروانے سے منع کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس رویے پر دانش کے والد کو بہت حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب دانش کے والد کی پریشانی کو سمجھ گئے، جس کو دیکھ کر انھوں نے دانش کے والد کو بتایا کہ کچھ ڈاکٹر صاحبان کسی مخصوص کمپنی کی ادویات کے عوض بھاری کمیشن وصول کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ماہانہ اہداف طے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبان اس اہداف کو پورا کرنے کے بدلے میں دوسرے ملکوں کے دورے، اپنے ہسپتالوں کی آرائش بھی کرواتے ہیں۔ یہاں تک ہی نہیں بلکہ ڈاکٹروں کے بچوں کی فیس، اس کے ڈرائیور اور ملازمین کی تنخواہ بھی یہ دواساز کمپنیاں ہی دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ جو ٹیسٹ کروایے جاتے ہیں ان میں زیادہ منافع ہے۔ ہزاروں روپے میں جو ٹیسٹ کروائے جاتے ہیں وہ بھی بلاوجہ ہوتے ہیں۔ ان میں اکثر ایسے ٹیسٹ ہوتے ہیں جن سے اصل بیماری کی تشخص نہیں ہوتی۔ کچھ ٹیسٹوں کے پیسے زیادہ وصول کیے جاتے ہیں۔ مصنف نے ڈاکٹر معراج کے ذریعے ہمارے معاشرے میں چلنے والے اس گھناؤنے دھندے کا پردہ چاک کیا ہے۔ ڈاکٹر شعیب سڈل لکھتے ہیں:

> "ڈاکٹروں اور پیروں کے طریقہ علاج اور اس شعبے میں پائی جانے والی خامیوں اور شعبدوں بازیوں کو مصنف نے وضاحت سے بیان کیا ہے تاکہ ایسے سپیشل بچوں کے والدین مزید مشکلات کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔"(6)

دانش کو جب نیوروز فزیشن کے پاس لے کر گئے تو اس نے دانش کا سی ٹی سکین کروانے کا مشورہ دیا۔ جس ہسپتال میں دانش کا سی ٹی سکین ہوا، وہاں دانش اور اس کے والد صاحب کو انوکھا رویے کا سامنا کرنا پڑا۔ دانش کے والد نے دانش کو اس ہسپتال کے سٹور سے جوس اور بسکٹ لے کر دیا اور اپنے لیے پانی لیا۔ جب بل دیکھا گیا تو ہر چیز کی قیمت دوگنی وصول کی گئی تھی۔ دانش کے والد کے احتجاج کرنے پر سٹور والا کا جواب تھا کہ سر جی! یہی ریٹ لگتا ہے، چیزیں لینی ہیں تو لیں ورنہ کہیں اور سے جا کر لے لیں۔ ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ جو طاقت ور طبقہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ مظلوم طبقے کا استحصال کرتا ہے۔ جو انسان جس حد تک کسی مظلوم سے چھین سکتا ہے وہ چھین لیتا ہے۔ امیر امیر سے امیر تر ہونے کی جستجو میں ہے جبکہ غریب غریب سے غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں پہلے حصے کو اختتام ہوتا ہے۔

دوسرے حصے میں مصنف اپنے ماضی کی ایک کہانی بتاتا ہے۔ اس حصے کے اہم کرداروں میں یوسف، اس کا چھوٹا بھائی فاضل اور مصنف ہیں۔ یوسف مصنف کا ایک پرانا ساتھی اور ہم جماعتی تھا، جسے وہ پچھلے چالیس سال سے جانتا ہے۔ یوسف کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے۔ اس کے گھر میں گیارہ افراد تھے، جن میں پانچ بھائی، چار بہنیں اور والدین شامل تھے۔ یوسف کو میٹرک کرنے کے بعد اپنی تعلیم کو چھوڑنا پڑا کیونکہ اس کے والدین نے گھریلو مسائل کی وجہ سے

اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازات نہیں دی تھی۔ یوسف کے بھائی فاضل کا شمار ذہین طلبہ میں ہوتا تھا۔ یوسف اور اس کے والدین کی شدید خواہش تھی کہ فاضل ایک بڑا افسر بنے، لیکن فاضل کی توجہ تعلیمی سرگرمیوں کی بجائے کھیلوں میں زیادہ تھی۔ جب فاضل کا میٹرک کا رزلٹ آیا تو یہ اس کے گھر والوں کے لیے انتہائی حیران کن تھا کہ فاضل آٹھ مضامین میں سے پانچ مضامین میں بُری طرح فیل ہے۔ یوسف کے والدین نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب فاضل کو مزید کوئی موقع دینے کی بجائے اسے کسی کام کرنے والی فیکٹری یا دکان پر لگا دیا جائے تاکہ وہ گھر کے اخراجات میں کچھ مدد کر سکے۔ یہاں ہمیں اپنے معاشرے کے زیادہ تر والدین کا رویہ نظر آتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے ان کا بیٹا امتحان میں کامیابی حاصل نہیں کر سکا یا پھر پیچھے رہ جاتا ہے تو وہ یہ طے کر لیتے ہیں کہ ان کا بچہ کبھی زندگی میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا اور وہ اسے کسی قسم کا دوسرا موقع دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

فاضل کی والدہ اسے دوسرے دن ایک چمڑے والی فیکٹری میں چھوڑ آئی۔ فاضل کو ایک دن کام نہ آنے کی وجہ سے اس کے استاد سے ڈانٹ پڑنے پر اس نے محلے میں واقع حکیم کی دکان سے تھوتھے کی ایک ڈالی لے کر پانی سے نگل لی، جس کی وجہ سے فاضل کی حالت ناساز ہو گئی۔ اس وجہ سے یوسف کافی پریشان تھا۔ کوئی ایک ہفتے بعد فاضل کی صحت میں کافی حد تک بہتری آ گئی تھی۔ اب فاضل کے لیے ایک نیا کام تجویز کیا گیا۔ اسے گوجرانوالہ میں واقع سٹیشنری کا سامان بنانے والی فیکٹری میں بھرتی کروا دیا گیا۔ فاضل اب ہر روز گوجرانوالہ جاتا تھا، اور رات گئے تھک ہار کر واپس آتا۔ اب فاضل نے نوکری کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن یہ فیصلہ وقتی ثابت ہوا، کیونکہ بہت زیادہ تھک جانے کی وجہ سے فاضل اپنی پڑھائی کو وقت نہیں دے پاتا تھا، اسے لیے اس نے پڑھائی کرنے کا منصوبہ ترک کر دیا۔ یوسف اب بھی یہ ہی چاہتا تھا کہ فاضل تعلیم حاصل کرے، چنانچہ یوسف ایک دن فاضل کو لے کر مصنف کے آفس آ گیا۔ مصنف نے فاضل کی تعلیمی سرگرمیوں کو چیک کرنے کے لیے میٹرک کی اردو اور انگریزی زبان کی کتاب پڑھ کر سنانے کو کہا جو اس نے بہت روانی سے سنا دی۔ اب اس کی لکھنے کی صلاحیت چیک کرنے کے لیے مصنف نے اسے اردو اور انگریزی زبان کے چند الفاظ بولے جس کی املا اس نے بالکل درست لکھ دی۔ یوسف مصنف سے یہ چاہتا تھا کہ وہ اس کے والدین سے بات کریں، کیونکہ مصنف پڑھائی میں بہت اچھا تھا اور کئی امتیازی پوزیشین حاصل کر کے میرٹ پر سکالرشپ حاصل کر چکا تھا۔ فاضل اور یوسف کے کہنے پر مصنف اگلے دن یوسف کے والدین کے پاس فاضل کو مزید پڑھانے کی سفارش لے کر گیا۔ مصنف نے مختلف دلائل کے ذریعے یوسف کے والدین کو اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کی کہ وہ فاضل کو ایک اور موقع دے دیں اور بالاخر مصنف یوسف کے والدین کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، لیکن اس شرط پر کہ اگر مصنف ذمہ داری لے تو وہ اپنے بیٹے کو آگے پڑھنے کی رضامندی دیں گے۔ مصنف نے فاضل کو پڑھانے کی حامی بھر لی۔ فاضل اب شام کے وقت مصنف کے پاس پڑھائی کے لیے آنے

لگا۔ فاضل کے دیکھا دیکھی چند اور طالب علم بھی آنے لگے اس طرح ایک مختصر جماعت بن گئی۔ یوسف کا خیال تھا کہ فاضل کو سائنسی مضامین کے ساتھ میٹرک کا امتحان پاس کرنا چاہیے، کیونکہ سائنسی مضامین کی وجہ سے نوکری ملنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم آج اس دور میں کھڑے ہیں جہاں کوئی بھی مضامین صرف اس غرض سے منتخب کیے جاتے ہیں کہ ہمیں نوکری جلدی مل جائے گی جو کہ ایک عجیب رویے کا عکاس ہے۔ تعلیم نوکری کے حصول کا ذریعہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا مقصد اپنے کردار کو سنوارنے اور خود کو معاشرے کا ایک اچھا شہری بنانا ہونا چاہیے۔
یوسف کی خواہش کے مطابق فاضل کو مصنف نے سائنسی مضامین پڑھانے شروع کر دیے، لیکن سائنسی مضامین فاضل کے مزاج کے مطابق نہیں تھے، جس کی وجہ سے اسے ان مضامین کو پڑھنے میں بہت مسائل پیش آرہے تھے۔ یہاں مصنف نے ایک اور بڑے مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر والدین بچوں کو اس کی مرضی کے خلاف سائنسی مضامین پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ لیکن یہ مضامین ان کی تعلیمی دلچسپی پر بُرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جب بچہ ذہنی طور اس مضمون کو پڑھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو گا، تو وہ کیسے کسی مضمون کو اچھے سے سمجھ سکتا اور اس میں آگے بڑھ سکتا ہے۔ چونکہ سائنسی مضامین فاضل کے مزاج کے مطابق نہ تھے، اس لیے مصنف نے فاضل کو آرٹس کے مضامین کے ساتھ میٹرک کا امتحان دینے کا مشورہ دیا۔ اب فاضل آرٹس کے مضامین کو بڑی محنت کے ساتھ پڑھتا تھا۔ فاضل نے آرٹس کے مضامین کے ساتھ میٹرک کا امتحان دیا۔ اور آرٹس گروپ میں اپنے علاقے میں اول پوزیشن حاصل کی۔ پھر فاضل نے بی۔ اے کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا۔ لیکن ایک حادثہ کی وجہ سے اس کے والد کی ٹانگ ٹوٹ گئی، جس کی وجہ سے فاضل اپنی تعلیم آگے جاری نہ رکھ سکا اور اس نے پنجاب ورکرز ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ میں بطور کلرک نوکری شروع کر دی ۔ لیکن مصنف کی یہ خواہش تھی کہ فاضل اپنی تعلیم جاری رکھے۔ نوکری کے دوران فاضل نے ایم۔ اے اکنامکس کا امتحان درجہ اول کے ساتھ پاس کر لیا تھا۔ فاضل نے مصنف کے کہنے پر مقابلے کا امتحان دیا لیکن ناکام ہو گیا، اب فاضل نے دوبار مقابلے کا امتحان دیا لیکن ناکام رہا اور اپنا ارادہ ترک کر دیا لیکن مصنف کا ماننا تھا کہ فاضل یہ کر سکتا ہے۔ مصنف کا کہنا تھا:

"اگر راستے پہ چل کر تم منزل تک نہیں پہنچ پا رہے تو اس راستے میں تھوڑی تبدیلی کر لو۔۔۔ اپنا راستہ بدل لو۔۔۔ کوئی ایسا مقابلے کا امتحان دیکھو جو نسبتاً آسان ہو۔۔۔ کم پیپروں پر مشتمل ہو۔۔۔ لیکن ہمت نہ ہارو۔۔۔ قدرت کبھی کبھی ہمیں ناکامی کا منہ دکھا کر ہمارے ارادوں کی مضبوطی کو چیک کرتی ہے۔۔۔Never give up۔۔ تم کر جاؤ گے۔ تم کر سکتے ہو۔"(7)

اس کے بعد فاضل نے محکمہ خزانہ پنجاب میں افسروں کی بھرتی میں ہونے والے امتحان میں صوبے بھر میں اول پوزیشن حاصل کی۔ یہ مصنف کا یقین کامل تھا کہ ایک دن فاضل اس اعلیٰ مقام تک پہنچ گیا۔ اگر انسان محنت اور ہمت سے کام لے تو وہ کسی بھی امتحان میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اس حصے کا اختتام پر مصنف یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جیسے فاضل کو دوسرا موقع ملنے پر آج وہ ایک اچھی جگہ پہنچ گیا ہے اس طرح ہر انسان کو دوسرا موقع ملنا چاہیے، تاکہ وہ زندگی میں کوئی مقام حاصل کر سکے۔ یہاں پر دوسرے حصے کا اختتام ہوتا ہے۔

تیسرے حصے میں مصنف پھر حال کی بات شروع کر دیتا ہے۔ اب مصنف کی ٹرانسفر سیالکوٹ ہو گئی۔ مصنف نے دانش کی والدہ سے اس رویے کے بارے میں پوچھا، جس کے جواب میں دانش کی والدہ عام ماؤں کی طرح اپنے بچے کی غلطیوں پر پردہ ڈالنا شروع کر دیا۔ دانش کی والدہ کم سے کم باتیں دانش کے والد صاحب کو بتاتی تاکہ اسے کسی قسم کی کوئی سزا نہ ملے۔ دانش کے والد کے پوچھنے پر کہ یہ ساری باتیں انھیں پہلے کیوں نہیں بتائی تو اس پر اس کی والدہ کا عام ماؤں کی طرح یہ ہی جواب تھا کہ میں نے سوچا خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں ایک اور بڑا رویہ سامنے آتا ہے کہ کسی بھی معاشرے میں کوئی بھی ماں اپنی اولاد کو قصور وار ثابت نہیں کرتی اور نہ اسے سز دے سکتی ہے۔

دانش کی والدہ کا اس بات پر اصرار تھا کہ مزید دانش پر کسی قسم کا کوئی تجربہ کرنے کی بجائے اسے کسی اچھے ہسپتال میں داخل کروایا جائے اور کسی اچھے ڈاکٹر سے اس کا علاج کروایا جائے۔ لیکن دانش کے والد صاحب اس کے لیے رضامند نہ تھے۔ وہ تین وجوہات کی بنا پر دانش کو ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل نہیں کروانا چاہتے تھے :

> "اول: ہمارے ملک میں ذہنی امراض کے علاج کے لیے معیاری سہولیات میسر نہیں ہیں۔ دوم: معاشرے میں ذہنی اور نفسیاتی امراض کا علاج کروانا ویسے ہی معیوب سمجھا جاتا ہے، الٹا ایسے مریضوں کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ سوم: میں دانش کو کچھ دن اپنے زیر مشاہدہ رکھ کر اس کی ذہنی کیفیت کو بہتر طور پر سمجھنا چاہتا ہوں تاکہ اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکے"(8)

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں نفسیاتی امراض میں مبتلا لوگوں کو "پاگل" جیسے لفظ سے نوازا جاتا ہے، یا کسی نہ کسی طرح سے ان کی ذہنی امراض کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان کو مذاق کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں احساس کی جگہ بے رحمی اور رحم دلی کی جگہ ستم گری نے لے لی ہے۔

دانش کے والد صاحب دانش کو اپنے ساتھ سیالکوٹ لے گئے۔ سیالکوٹ پہنچنے کے بعد دانش کے ساتھ کچھ دن پڑھائی کے متعلق ان کے والد نے کوئی بات نہیں کی۔ ان دنوں دونوں باپ بیٹا وہی کام کرتے جو دانش کو پسند تھے، جن میں اینگری برڈ، گیم کھیلتے، باہر گھومنے جاتے، مل کر آئس کریم کھاتے وغیرہ شامل ہے۔ کافی دن گزر جانے کے بعد دانش

جب ماحول سے مانوس ہو گیا تو اس کے والد نے اسے سکول بیگ لانے کو کہا تو دانش کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی۔ دانش کو جب اردو پڑھنے کو کہا گیا تو اس نے مسکرانا شروع کر دیا جس کا ذکر اس کی پہلی دو اساتذہ کر چکی تھی۔ اس کے بعد دانش نے ہر وہ ہی بات اور حرکت کی جس کے بارے میں اس کی اساتذہ اس کے والد صاحب کو بتا چکی تھی۔ دانش کے والد کے پڑھانے کے باوجود دانش کو ایک دو الفاظ کے سوا کچھ نہ یاد ہوا، جس کی وجہ سے اس کے والد نے غصے میں اس کو تھپڑ بھی مارا۔ جس پر دانش نے کہا:

"پاپا! آپ تو میرے اپنے ہیں۔۔۔ آپ کو تو میرا مسئلہ اور پریشانی سمجھنی چاہیے۔۔۔ پاپا! میں کیسے بتاؤں آپ کو۔۔۔ میں ابھی چھوٹا ہوں پاپا!۔۔۔ میں اپنا مسئلہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔۔۔ آپ کو میری بے بسی کا اندازہ ہونا چاہیے۔۔۔ ماں باپ تو اولاد کی سوچ پڑھ لیتے ہیں۔۔ آپ کیوں نہیں پڑھ پا رہے؟"(9)

دانش کے والد نے دانش کی پڑھائی کے حوالے سے انٹرنیٹ سے مدد لی۔ گوگل میں "لرننگ ڈس آرڈر" ریسرچ کیا اور زیادہ ویب سائیڈ میں ایک لفظ "ڈسِ لیکسیا" (Dyslexia) بہت زیادہ استعمال ہوا ہے۔ ڈس لیکسیا بنیادی طور پر ایک ایسی ذہنی بے قاعدگی ہے جو زبان کو سمجھنے اور سیکھنے کی صلاحیت کو متاثر کرتی ہے۔ بقول علی شاہ:

"ڈس لیکسیا؟ اصل میں پڑھنے میں دشواری کی کیفیت کا نام ہے یعنی اعصاب سے متعلق ایک ایسی ذہنی بے قاعدگی جو زبان سیکھنے کی مہارت کو متاثر کرتی ہے۔ اس کیفیت سے نجات صرف والدین ہی دلوا سکتے ہیں کیونکہ جماعت میں طلبا کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے اساتذہ ایسے بچوں پر توجہ نہیں دے سکتے۔(10)

اس میں ادائیگی کے عمل، ان کے پڑھنے لکھنے اور بولنے کے تلفظ اور حساب کتاب کی استعداد متاثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ الفاظ کی پہچان نہ کر سکنا مثلاً p اور q میں وغیرہ۔ ڈس لیکسیا کی جس قسم میں لکھائی متاثر ہوتی ہے اسے "ڈس گرافیا" کہا جاتا ہے۔ ڈس گرافیا کے متعلق مسائل دانش کے اندر موجود تھے۔ ایک تحقیق کے مطابق ڈس لیکسک بچے کو نارمل بچے کی نسبت پانچ گنا زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اس ساری معلومات کے بعد مصنف نے دانش کے متعلق سوچا کہ کیا اس کو اردو اور انگریزی حروف تہجی کی پہچان ہے؟

رات کو باتوں کے درمیان مصنف نے دانش سے پوچھا کہ کیا تمھیں "الف، ب" آتی ہے۔ مصنف کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ دانش تین سال سکول جانے کے باوجود پوری الف، ب ہی نہیں جانتا۔ مصنف نے اسی رات دانش کو "الف" سے "ذ" تک حروف تہجی یاد کروادی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ دانش کند ذہن نہیں ہے۔ دانش نے چار پانچ دنوں

میں پوری حروف تہجی یاد کرلی۔ لہٰذا مصنف نے دانش کو حروف تہجی کی پہچان کر کے بتانے کو کہا کہ کون سا لفظ کیسے لکھا جاتا ہے اور کیسی آواز نکالتا ہے۔ لیکن یہ بھی بات کافی حیران کن تھی کہ دانش کو تین سال سکول جانے کے باوجود حروف تہجی کی پہچان نہ تھی۔ دانش کے والد صاحب نے پھر اسے حروف تہجی سے متعارف کروایا۔ اس کے بعد انگریزی زبان کے حروف تہجی کی باری تھی۔ دانش نے زبانی انگریزی حروف تہجی یاد تو کرلی لیکن وہ انگریزی کے حروف پڑھ نہیں سکتا تھا۔ مصنف نے دانش کو انگریزی کا سبق دیا لیکن شام میں سناتے وقت دانش نے پھر وہی رد عمل دیا جو اس نے اردو کی کتاب کو پہلی بار پڑھتے ہوئے دیا تھا، جس کی وجہ سے مصنف بہت بد دل ہوا۔ مصنف نے اگلے دن دانش کو بڑی توجہ کے ساتھ انگریزی کا ایک سبق پڑھایا اور دانش نے بھی اسے آدھا گھنٹہ بڑی توجہ سے یاد کیا، لیکن سنانے پر اس کا پھر وہی رد عمل تھا جیسے کے پہلے وہ دو بار دے چکا تھا۔ مصنف کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ دانش جو لفظ ادا کر رہا ہے اس کی نظر اس لفظ پر نہیں ہے اور یہ شک اس وقت یقین میں بدل گیا جب دانش کو آخری ادا کیے ہوئے لفظ پر انگلی رکھنے کو کہا گیا تو اس نے غلط لفظ پر انگلی رکھی۔ لیکن دانش ایک دو سطر سے زیادہ نہ سنا سکا۔ مصنف نے دانش کو پڑھتے وقت مشاہدہ کیا کہ وہ سبق کو زبانی یاد کرلیتا تھا۔

اگلے روز صبح جب مصنف نے دانش سے پوچھا کہ "اے" کیسی آواز نکالتا ہے تو دانش کے مطابق اسے یہ کسی نے نہیں سیکھایا۔ اب مصنف نے دانش کو حروف کی بنیادی آوازیں کے متعلق بتانا شروع کیا اور ساتھ ہی اس کو سمجھنے کے لیے مثالیں بھی دی تاکہ وہ انھیں آسانی سے یاد کرسکے۔ دانش نے ایک ہفتے میں انگریزی اور اردو حروف تہجی کی آوازیں پہچاننا شروع کردی تھی۔ اب دانش اردو اور انگریزی کی کتب کا آغاز کیا۔ یہ بڑی خوش گوار بات تھی کہ دانش نے اردو کی کتاب کا سبق سناتے وقت نہ مسکرایا تھا اور نہ ہی خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ کیونکہ دانش کو اب حروف کی پہچان تھی جس کی وجہ سے اسے زبانی سارا سبق یاد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مصنف کے مطابق ماہر نفسیات کی ضرورت کس کو تھی دانش کو یا ان ناتجربہ کار ٹیچرز کو جو بچوں کے ذہنی مسائل، الجھنوں اور پیچیدہ رویوں سے ناواقف ہونے کی بناپر کند ذہن، غبی اور ذہنی مریض قرار دیتی ہیں۔ سردار محمد شیم خان نے اس ناول پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ایک حقیقی کہانی ہے۔ جہاں مصنف جیسے والدین اپنے بچوں کی تربیت اور اس کے مسائل کے حل کے لیے کوشاں رہتے ہیں جو ان کی محبت کا واضح ثبوت ہے۔ بقول سردار محمد شیم خان:

> مصنف نے آج کل کے ماڈرن سکولوں میں اساتذہ کی طلبا کے ساتھ عدم دلچسپی
> کا خوب صورت انداز میں اظہار کیا ہے اور تاثر دیا ہے کہ وہ صرف دولت کمانے
> پر توجہ مرکوز کرتے ہیں"(11)

یہاں ہمارے معاشرے میں موجود ایک بڑی خامی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ہمارے ہاں کم تعلیم یافتہ افراد کو کم پیسوں میں بطور استاد ملازمت دے دی جاتی ہے، لیکن وہ استاد اپنی لاعلمی کی وجہ سے بچوں کی نفسیاتی مسائل کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا، جس کی وجہ سے دانش اور اس جیسے بہت سے ذہین بچوں کو کند ذہن اور کم عقل ہونے کے طعنے سہنے پڑتے ہیں۔بقول امجد اسلام امجد:

> "علی ارشد رانا کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے معاشرے اور تعلیمی اداروں کے رویوں کی نفسیات کے ماہرین کی غلط کاریوں کو بڑے سلیقے سے اپنی کہانی کا حصہ بنایا ہے۔اس پوری کتاب کے مطالعے سے جو حتمی نتیجہ بر آمد ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ ہمیں بچوں کی نفسیات کو سمجھنا چاہیے۔اور ان کی فطری کمزوریوں پر سینہ کوبی کی بجائے اسکا عملی اور عقلی حل تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"(12)

اب دانش ہر روز کوئی دو تین کہانیوں کی کتابوں کا انتخاب کر لیتا تھا اور شام کے وقت اپنے والد صاحب کو سنا دیتا تھا۔اس بار دانش اپنے گھر واپس اپنے ماں اور دوسرے گھر کے افراد سے ملنے آیا تو یہ جان کر سب بہت حیران تھے کہ دانش نے پڑھنا لکھنا شروع کر دیا ہے۔ہمارے ہاں ایک رویہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ والدین اپنے بچوں کے لیے کسی مستقبل کا تعین نہیں کرتے۔نہ خود ان کے لیے خواب سجاتے ہیں اور نہ اپنے بچوں کو اس کی طرف مائل کرتے ہیں جس کی وجہ سے بچے میں کبھی بھی وہ لگن اور شوق پیدا نہیں ہوتا جو اسے مستقبل میں منفرد مقام بنانے کی طرف توجہ دلاتا۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ آج کے دور میں والدین کے پاس دولت کمانے ،بڑے بڑے سکولوں میں بچوں کو داخل کروانے ،بڑے بڑے گھر بنانے کا تو وقت ہوتا ہے لیکن بچوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کے ساتھ بات کرنے کا وقت نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے بچے اپنے اندر خود اعتمادی پیدا نہیں کر سکتے اور نہ وہ زندگی میں اس طرح سے آگے بڑھ سکتے ہیں ،جیسے دوسرے بچے جن کا اپنے والدین کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں،اس کی وجہ سے زندگی میں اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں۔اس ناول کے آخر میں علی ارشد ناول صاحب یہ والدین کو مشورہ دیتے ہیں:

> "پہلی جماعت سے لے کر پانچویں جماعت تک۔۔۔۔صرف پانچ سال۔۔۔۔صرف پانچ سال تک ہر روز صرف ایک گھنٹہ نکال لیں۔۔۔اپنے لیے،اپنے بچوں کے لیے،اس ملک کے لیے،اس معاشرے کے لیے۔۔۔۔۔"(13)

اس ناول کے اوپر تبصرہ کرتے ہوئے علی اکبر ناطق لکھتے ہیں:

> "اس ناول کو پڑھنے کے بعد بذات خود مجھ پر ایک رقت طاری ہو گئی اور دل نے بآواز بلند پکارا کہ یہ تو میری بھی کہانی ہے۔میرے خیال میں علی ارشد رانا نے یہ ناول لکھ کر ہمارے

معاشرے پر ایک احسان کیا ہے اور ہمیں یہ احسان اس ناول کو پڑھ کر اپنے معاشرے کی
از سر نو تربیت کر کے اتارنا ہے۔"(14)

حصول علم کے حوالے سے وہ یہ بتاتے ہیں کہ بچوں کو ابتدائی سالوں میں بنیادی زبانوں کا ماہر بنائیں اور انہیں سائنس، مذہب کے حوالے سے معلومات دیں۔ اس ناول کا اختتام وہ ان الفاظ سے کرتے ہیں:

"اولاد بہت قیمتی سرمایہ ہے۔۔۔اس کا کوئی نعم البدل نہیں۔۔۔اس کی قدر کیجیے۔۔۔یہ رب کی بہت بڑی نعمت ہے۔۔اس کی قدر ان سے پوچھیے جو اس نعمت سے محروم ہیں۔۔۔یقین کیجیے ان کے لیے زندگی کی تمام آسائشیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔۔۔وہ زندگی بھر صرف ایک ہی بات سوچتے رہتے ہیں کہ ان کو اولاد کیوں نہیں ملی۔اسی محرومی کے دکھ کے ساتھ جیتے ہیں اور اسی دکھ میں جلتی ہوئی سانسوں کے ساتھ رخصت ہو جاتے ہیں۔"(15)

ارشد علی رانا کا تحریر کردہ یہ ناول تربیت اولاد اور انسان کی فطرتی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں استاد اور معاشرے کے کردار کے موضوع کا عکاس ہے۔بچوں کی تربیت کے حوالے سے سماجی شعور کا نہ ہونا دراصل ایسی بد قسمتی ہے، جس پر ہماری نگاہ نہیں جاتی۔تربیت کردار اور شعوری تربیت ایسے ہنر ہیں جن سے قوموں کی تقدیر سنواری جاسکتی ہے۔بچے کی تربیت کا پہلا مرکز اس کی ماں کی گود ہوتی ہے، گویا گھر وہ گہوارہ ہے جہاں ایک نامولود کی شخصی تربیت کی جاتی ہے جبکہ مدرسہ کردار سازی میں مددگار ہے۔ جبکہ استاد معمار قوم ہے۔والدین تربیت کے ضمن میں بری الذمہ نہیں۔ دولت کمانے بڑے بڑے گھر بنانے اور بچوں کو اعلیٰ طرز زندگی دینے سے بہتر ہے کہ بچوں کی کردار سازی اور پڑھائی پر توجہ دی جائے۔والدین کے لیے ان کا بچہ ان کی اولین ترجیحات میں ہونا چاہیے۔ کیونکہ والدین کی ذرا سی بے توجہی اُسے زندگی کے میدان میں دوسروں سے پیچھے کر سکتی ہے۔ڈاکٹر محمود الحسن ناول پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"علی ارشد رانا کا ناول "جلتا رہا چراغ یقین و گمان کا" اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ایک موثر اور توانا ناول ہے۔انھوں نے باپ بیٹے کی کہانی کو اپنی طرز نگارش سے پاکستان کے ہر گھر، معاشرے اور پوری قوم کی کہانی بنا دیا ہے۔ کہانی پڑھ کر قاری کو لگتا ہے کہ جیسے مصنف نے اس کے ماضی سے نقاب اٹھا دیا ہے۔ناول کی زبان سلیس اور رواں ہے۔ کہانی اصلاح اور مقصدیت سے بھرپور ہے۔ علی ارشد رانا نہ صرف ہمارے کمزور تعلیمی نظام کا پردہ چاک کرتے ہیں بلکہ احساس دلاتے ہیں کہ ہمیں بحیثیت والدین اور بطور قوم اس کی توجہ دینی چاہیے اور اسے نئے سرے سے منظم کرنا چاہیے۔"(16)

بچوں کی نفسیاتی الجھنیں اور پیچیدہ رویے دراصل والدین اور اساتذہ کی ناتجربہ کاری ہوتی ہے جس کی بنا پر پہلے تو ہو کند ذہن اور بلا آخر وہ ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں اکثر ذہین بچوں کو پاگل یا ضدی قرار دے کر انھیں نظر انداز کرتے ہیں اور دوسری اولاد کو ان پر فوقیت دیتے ہیں جس سے وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر مزید نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مصنف نا صرف اہم سماجی مسائل کی نقاب کشائی کرتے ہیں بلکہ ناول کے اختتام پر اس کا حل بھی تجویز کرتے ہیں، گویا مصنف کا کام صرف نشتر زانی نہیں بلکہ وہ سماجی مسائل کی جراحی کرتے ہیں۔

"خدارا اپنے بچوں کی پڑھائی پر توجہ دیجیے۔ ان سے ہر روز پوچھیے کہ انہوں نے آج کیا پڑھا ہے۔ ان سے ہر روز پوچھیے کہ ان کو پڑھائی میں کیا مسائل در پیش ہے۔ ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ ہمارے بچے ہیں۔ ان کو اپنی ترجیحات میں پہلے نمبر پر رکھیے۔ ان کی تعلیم و تربیت کو سب کاموں پر فوقیت دیجیے۔ یقین کیجیے کہ ذرا سی توجہ آپ کے بچے کو عرش پر بیٹھا سکتی ہے جبکہ ذرا سی غفلت آپ کے بچے کو پاتال میں گرا سکتی ہے۔"(17)

تمام علوم کے حصول کا ذریعہ کوئی نہ کوئی زبان ہوتی ہے۔ اپنے بچوں کو ابتدائی سالوں میں بنیادی زبانوں کا ماہر بنا دیں۔ انہیں حروف کی آوازیں سکھایئے۔ پھر انہیں حروف کو ملا کر الفاظ بنانا سکھایئے۔ انہیں الفاظ کو درست تلفظ کے ساتھ پڑھنا سکھایئے۔ پھر انہیں الفاظ کو لکھنا سکھایئے۔ پھر ان الفاظ سے فقرے بنانا سکھایئے۔ ان فقرات کو ملا کر پیرے بنانا سکھایئے۔ ان سے ہر روز کچھ نہ کچھ لکھوایئے۔ ہر روز ،بلاناغہ ۔۔ان کا ذریعہ علم مضبوط کر دیجیے۔ علم کو حاصل کرنا کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔ منظر کشی کے حوالے سے دیکھا جائے تو راشد علی رانا نے ننکانہ صاحب، لاہور، مرید، سیالکوٹ کا تعارف کروایا اور ان علاقوں کی منظر کشی کی ہے۔ پاکستان کی ثقافت اور تہذیب کو سماجی شعور کے ساتھ مناظر عام پر لایا ہے۔ اسطرح بیک وقت یہ ناول سماجی، تہذیبی اور تاریخی حوالے سے ایک منفرد مقام اور خاص اہمیت کا حامل ہے۔ زندگی کے مختلف شعبہ جات میں کونسلنگ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے بھی فرد کی کونسلنگ اس کے مسائل کے حل اور اس کی کامیابی کا گُر ہے۔ مذہب، اعتقاد اور نفسیاتی لحاظ سے کونسلنگ کے لیے استاد اور والدین کا کردار بہت اہم ہے۔ خصوصی طور پر جسمانی اور ذہنی معذوری کے حامل بچوں کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ سماجی اصلاح کے اس پہلو کی طرف نشان دہی کی گئی ہے جس سے نہ صرف بچے کی زندگی بلکہ پورے معاشرے کی بھی اصلاح ہوتی ہے۔ استاد اور والدین بچوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے ان کے ابتدائی پانچ سالوں کو نظر انداز نہ کریں کیونکہ مکمل شخصیت سازی کے عمل میں بچے کی ابتدائی زندگی ہی انتہائی اہم ہے۔

حواشی وحوالہ جات

1۔سید احتشام حسین،بحوالہ: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ،مرتب:مشرف احمد، نفیس اکیڈمی،لاہور،1986ء،ص:45

2۔احسان اکبر، پاکستانی ناول،ہیت،رجحان،اور امکان،مشمولہ:پاکستانی ادب، جلد پنجم، مرتبین :رشید امجد،فاروق علی،ایف.جی سرسید کالج، رولپنڈی، جنوری1986ء،ص13

3۔افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد،2009 ء،ص4

4۔علی ارشد رانا، انٹرویو،بذریعہ ٹیلی فون ازماریہ خان، ٹیکسلا،19 اکتوبر2021، بوقت نو بج کے30منٹ

5۔علی ارشد رانا ,جلتا رہا چراغ یقین و گمان کا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،2021 ،ص 81 1

6۔ایضاً،ص173

7۔ایضاً،ص75

8۔ایضاً،ص86-87

9۔ایضاً،ص93،92

10۔ایضاً،ص168

11۔ایضاً،ص155

12۔ایضا،فلپ

13۔،ایضاً،ص150

14۔ایضاً،فلپ

15۔ایضاً،151

16۔محمود الحسن،ڈاکٹر،انٹرویو،از ماریہ خان، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لنگویجز،اسلام آباد ،24 جنوری 2022ء،بوقت 11:30بجے

17۔علی ارشد رانا،جلتا رہا چراغ یقین و گمان کا،ایضاً،ص149-150

References in Roman Script:

1. Syed Ehtesham Hussain, Parim Chand ka Tanqeedi Matalaa, Compiler: Musharraf Ahmed, Nafees Academy ,Lahore, 1986, p. 45
2. Ehsan Akbar, Pakistani Novel, Hiyyat, Rujhan Awr Imkan, Mashmoola: Pakistani Adab, vol:5, Editors: Rashid Amjad & Farooq Ali, F.G Sir Syed College Rawalpindi, January 1986, p. 13
3. Afzal Butt, Dcotor, Ardo naaul min Samaji Shoor, Purab Akademi Islamabad,2009,p. 4
4. Ali Arshad Rana, Interview via Telephone by Maria Khan, Taxila, 19 October2021, time: 9:30 am

5. Ali Arshad Rana, Jalta Raha Charag Yaqeen wagymana ka, Sang mel public kitions,Lahore,2021,p. 181
6. Ibid., p. 173
7. Ibid., p. 75
8. Ibid., p. 86-87
9. Ibid., p. 92-93
10. Ibid., p. 168
11. Ibid., p. 155
12. Ibid., flap
13. Ibid., p. 150
14. Ibid., flap
15. Ibid., p. 151
16. Mahmood Al Hasan , Doctor, interview by Maria Khan, National University of Modern Languages, Islamabad, Junuary 24,2022 ,Time:11:30am
17. Ali Arshad Rana, Jalta Raha Charag Yaqeen wagymana ka, Sang mel public kitions,Lahore,2021,p. 149-150